فریڈرک ولہیلم نطشے

تحریر: ہنری تھامس، ڈانالی تھامس

اردو ترجمہ: قاضی جاوید

یہ تحریر فکشن ھاؤس کی شایع کردہ کتاب "20 عظیم فلسفی" سے لی گئی ہے۔

Book:
Living Biographies of Great Philosophers

Authors:
Henry Thomas, Dana Lee Thomas

فیس بک گروپ: عالمی ادب کے اردو تراجم

www.facebook.com/groups/AAKUT/

17

فریڈرک وہیلم نطشے

1844 1900

نطشے کو پروشیا کے ایک بادشاہ کے حوالے سے فریڈرک وہیلم کا نام دیا گیا تھا۔ مگر وہ خود کو پروشین کے بجائے پول سمجھتا تھا۔ بات یہ ہے کہ وہ نیٹسکی خاندان سے تعلق رکھتا تھا..... وہ ایک سخت کوش امرا، جنگجو اور ''فوق البشر'' افراد کا خاندان تھا جو جان سوبسکی کی سلطنت سے آ کر جرمنی میں آباد ہو گیا تھا۔ آپ اُس کو ''اولمپیائی نیم دیوتاؤں یا اوتاروں'' کا خاندان قرار دے سکتے ہیں۔

نطشے کو آپ دیکھتے تو شاید کہہ اٹھتے کہ وہ اُس جلیل القدر درخت کی محض لاغر و ناتواں سی شاخ تھا۔ کمزور سا ڈھانچہ اُس کو اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا..... اعصابی درد، کمزور آنکھیں اور چکرا دینے والا سر درد بھی باپ کی طرف سے ہی اُس کے حصے آیا تھا۔ ایک رات اُس کا باپ، پادری نطشے، گھر کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ اچانک وہ چکرایا اور نیچے جا گرا۔ اُس کے سر پر پتھروں سے چوٹ لگی تھی۔

پادری نطشے سر کے فالج کا نشانہ بن گیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے، ایک سال کے اندر، وہ اِس جہانِ فانی سے گزر گیا۔ انہی دِنوں ننھے نطشے کی عمر سات سال ہوئی تھی۔ دہشت زدہ سحر انگیزی کے ساتھ اس سارے المیے کو اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا جب لوگ اُس کے زخم رسیدہ باپ کو اٹھا کر گھر لائے تھے اور اس کو بستر پر ڈال دیا تھا۔ پھر اس نے باپ کو مہینوں پر پھیلی ہوئی اذیت میں مبتلا دیکھا۔ اُس کا دماغ رفتہ رفتہ جواب دے رہا تھا۔ موت قدم بہ قدم پادری نطشے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ نطشے نے پھر اُس کو مرتے، دفن ہوتے دیکھا اور وہ قبر بھی دیکھی جس نے اُس کے باپ کو اپنے دامن میں چھپا لیا تھا..... ہمیشہ کے لئے۔ اُس نے یہ سب کچھ دیکھا۔ سب کچھ یاد رکھا۔

باپ کی موت کے بعد نطشے اور اس کی چھوٹی بہن الزبتھ چار عورتوں کے گھمبیر اور ملال انگیز سائے میں آ گئی..... ان عورتوں میں ایک اُن کی ماں، دوسری ان کی دادی اور باقی دو ان کی پھوپھیاں تھیں۔ وہ نسوانی ماحول تھا جس میں نطشے کی پال پوس ہوئی۔ اُس کے ذہن کی تشکیل بھی اس حوالے سے ہوئی..... زیادہ تر اس لئے بھی کہ وہ کھیل کود میں حصہ نہ لے سکتا تھا۔ پریشان کن سر دردوں اور کمزور آنکھوں نے اُس کو باندھ رکھا تھا! وہ اُس کی توانائی چوس گئیں۔ سکول کے ساتھیوں کے لئے نشانہ تضحیک تھا..... وہ نیم آنکھوں، کمزور و نازک بدن اور بڑے سے سر والا ''ننھا پادری'' ہی تو تھا۔ وہ صرف اپنی بہن کے ساتھ ہی وقت گزار سکتا تھا۔

واقعی بہن سے ہٹ کر وہ تنہا تھا..... بالکل اکیلا۔ وہ لڑکوں سے خائف تھا۔ اُن سے باتیں کرنے کا سلیقہ نہ جانتا تھا۔ وہ اُن کی زبان بول سکتا تھا اور نہ ہی سخت قسم کے لفظ اُس کو آتے تھے۔ اُس کی دُنیا بس یہ تھی کہ بہن کے ساتھ کھیلے یا پھر کتابوں میں سر کھپائے۔

وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتا رہتا..... ''بالکل اپنے باپ کی طرح''، اُس کی ماں فخر سے کہتی۔ ماں چاہتی بھی یہ تھی کہ باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے وہ پادری بن جائے۔ وہ بھورے گھنے بالوں، اُلو جیسی آنکھوں اور فصیح زبان کے ساتھ متاثر کن پادری بن سکتا تھا۔ وہ اپنے اجتماع کی تمام بوڑھی خواتین کے لئے مذہب کو روح پرور تجربہ بنا سکے گا۔ اور اُس کا چہرہ..... وہ دُنیا بھر کے دُکھوں کا تاثر دیتا تھا۔ اسی لئے تو جب پیدا ہوا تھا تو دیکھنے والوں نے کہا تھا کہ اُس کی آنکھیں مسیح کے دُکھوں سے لبریز نظر آتی

ہیں۔ ماں کا اصرار تھا کہ وہ ایک عظیم مقدر کا مالک ہے..... شاید کسی پیغمبر کا مقدر۔

ماں نے اُس کو پفورٹا کے تمہیدی سکول میں داخل کروا دیا۔ وہاں اُس نے شاعری اور سائنس اور یونانی اور لاطینی کا مطالعہ کیا..... یوں کہہ لیجئے کہ وہاں اس کو زندگی کے سوا سب کچھ پڑھایا گیا۔ آنکھیں اُس کو بدستور تنگ کر رہی تھیں۔ کتابوں کے مطالعے کے بعد اُس کو گھنٹوں تک تکلیف سہنی پڑتی تھی۔ اُس نے بستر پکڑا اور جینے کا ارادہ کھو دیا۔ چمک دار روشنی میں وہ آنکھیں کھلی نہ رکھ سکتا تھا۔ سورج سے اُس کا سر چکرانے لگتا اور درد سے اُس کا رونے کو جی چاہتا۔ ہاں بس رات تھی جو اپنے ٹھنڈے سایوں کے ذریعے اُس کو سکون بخشتی تھی۔ اب اس کو بس اندھیروں کا انتظار رہنے لگا..... روشنی سے محروم کمرہ ہو اور بستر کی خاموشی ہو۔ رات اُس کی دوست تھی..... رات اور تنہائی۔

خیر، اُس نے تنہائی کے لمحات میں دِل بہلانے کے لئے ایک مشغلہ ڈھونڈ لیا۔ اُس کے دِل میں موسیقی کا شوق پیدا ہو گیا۔ جب وہ ساز چھیڑتا یا دوسروں سے سنتا تو خوابوں کی دُنیا میں کھو جاتا۔ یہی نہیں۔ بلکہ ہوا یہ کہ اُس کی خوابوں کی زندگی رفتہ رفتہ اُس کی حقیقی زندگی بن گئی۔ خوابوں اور خیالوں میں اپنے آپ میں وہ تمام توانائیاں پاتا جن سے وہ محروم کیا جا چکا تھا۔ وہ اپنے جنگجو آبا و اجداد کی مہمیں، امنگیں اور جنگیں لڑتا۔ خوابوں میں وہ درد کے بغیر تشدد سے روشناس ہو سکتا تھا..

جاگتے لمحوں میں صورت حال برعکس تھی.. جاگتے لمحوں میں وہ تشدد کے بغیر درد میں مبتلا رہتا تھا۔ اُس کی اذیت دائمی، عاجز کر دینے والی اور تقریباً ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔ اُس نے موسیقی کی ایک دُھن تیار کی اور اُس کو دُکھ کے نام معنون کر دیا۔

مگر وہ جوان تھا اور زندہ رہنا چاہتا تھا۔ دُنیا کو دیکھنے پرکھنے کا عالمِ شباب کا تجسس اُس میں بھرا ہوا تھا۔ یہ شوق ذہنی تھا اور ساتھ ہی ساتھ، جہاں تک ممکن ہو، جسمانی بھی تھا۔ انہی دِنوں نطشے نے شراب پینی شروع کر دی۔ وہ ڈھیلے، لطیفے سناتا اور فحش شاعری لکھتا۔ کبھی کبھی وہ فاحشہ عورتوں کے کسی اڈے کا چکر بھی لگانے لگا۔ اُس نے بائرن کی ''چائلڈ ہیرولڈ'' پڑھی جو عنفوانِ شباب کی للکار ہے اور ''عنفوانِ شباب کی بائبل'' بھی۔ اچھا، آپ کو یقین نہ آئے گا۔ لیکن سچی بات ہے کہ اُس نے ایک ڈوئیل بھی لڑا۔ تو کیا وہ ایک اور گوئٹھے یا ایک اور فاوسٹ بن جائے گا؟ نہیں نہیں۔ اس کا بیمار بدن اس حد تک نہ جا سکتا تھا۔ اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔ درد بڑھ گیا تھا۔ طاقت اور بھی کم ہو گئی تھی۔ چند

مہینے عیاشی کے گزرے اور وہ پھر اپنی دُنیا میں لوٹ آیا۔ دوبارہ وہی تنہائیاں تھیں اور ہمارا فلسفی تھا۔ اُس کو خود سے نفرت سی ہو گئی۔

اِس کیفیت میں نطشے بون سے نکلا اور لیپزگ یونیورسٹی میں چلا آیا۔ اب وہ زبان کے مطالعے میں ڈوب گیا تھا۔ اُس نے چاہا کہ تبلیغ کے بجائے تدریس کے لئے زندگی وقف کر دے۔ بات یہ تھی کہ اب مذہب اُس کے دل کو سکون نہ بخشتا تھا۔ وہ شک وشبہات میں پڑ گیا تھا۔ ایمان کی زندگی میں اُس کو ایمان نہ رہا تھا۔ وہ سوچتا کہ آیا کوئی کمزور بدن میں طاقتور روح کے ساتھ گزارا کر سکتا ہے۔ سب سے زیادہ اُس کو جسمانی طاقت کی، شباب کے جوش و ولولے کی خواہش تھی۔ وہ اس حقیقت پر پیچ و تاب کھانے لگا کہ وہ پیدا ہی بوڑھا ہوا تھا۔ وہ زندگی کے حیات بخش سمندر میں غوطے لگانے اور طوفانی لہروں سے کھیلنے کی تمنا کر رہا تھا۔ مگر اُس کے پاؤں ساحل سے آگے اٹھنے سے منکر تھے۔ اُس کے لئے تو بس یہ تھا کہ ساحل پر لیٹا رہے اور سورج کو اپنے سست رَو خون میں ذرا سی گرمائش پیدا کرنے دے۔ اُس کی جنسی خواہش برائے نام ہی تھی اور وہ اِس بات سے خوف زدہ تھا۔ آخر وہ کیوں زندگی کے ثمرات سے محروم کر دیا گیا تھا؟ آخر کیوں اُس کو حواس کی مسرتوں کو ترک کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا؟

نطشے کو اپنے مذہب سے نفرت ہو گئی..... یہ مذہب ہی تھا جو اس تیاگ اور اِس دست برداری کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ مذہب اُس کی کمزوریوں کا مکمل مدافعتی نظام تھا۔ بلاشبہ اس مذہب کے اولیا کا اصرار تھا کہ ہم کو اپنے جذبوں سے نفرت کرنی چاہئے اور اُن سے پیچھا چھڑانا چاہئے۔ نطشے نے سوچا کہ کہیں اصل بات یہ تو نہیں کہ ان ولیوں نے ضرورت کو خوبی بنا لیا تھا؟ آخر کوئی کیوں اپنے جسم سے شرمندہ ہو..... اگر جسم مکمل طور پر صحت مند ہو اور اپنے فرائض ادا کرنے کے پوری طرح قابل بھی ہو؟ کہیں اصل معاملہ یہ تو نہیں کہ پہلے پہل چند خبطیوں نے اپنے خبط کو جائز پیش کرنے کی خاطر گناہ فطری کا تصور پیش کیا اور بعد کی اچھے بھلے انسانوں کی نسلیں بے وقوف بھیڑوں کی طرح ان پاگل دانش وروں کی پیروی کرتی چلی آ رہی ہیں؟ کیا ہمارا نام نہاد اخلاقی نظام فریب نہیں؟ کیا زندگی کا مقصد خوشیاں اور مسرتیں نہیں؟ زندہ رہنے کا عمل کیا زندگی کو قبول کرنا نہیں؟ اچھا تو پھر زندگی میں مذہب سے اُس کی دوری بڑھتی رہی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ مذہب زندگی کو قبول کرنے کی تلقین نہیں کرتا۔ وہ زندگی کا انکار کرتا ہے۔

اچھا، تو پھر کون سی شئے زندگی کا اثبات کرتی ہے اور اس کو بڑھاوا دیتی ہے؟ نطشے نے اِس سوال کا جواب یہ دیا کہ زندگی کا اثبات کرنے، اُس کو یقینی بنانے اور اُس کو بڑھاوا دینے والی شئے ''جینے کا ارادہ'' ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر نطشے اپنے ارادے کو مضبوط کر سکے تو وہ اپنی سر دردوں پر، اپنی سرگرانی پر اور اپنی تکلیف پر قابو پا سکتا ہے! صرف ارادہ ہی انسان کو آزاد کر سکتا ہے۔

یہ تھے وہ خیالات جو اس بیمار شخص کے ذہن نے پیدا کئے۔ نطشے سے دور کئی اور مقامات پر روگ سے اسی قسم کے خیالات جنم لے رہے تھے۔ امریکہ میں لوگوں کے کئی ایسے گروہ وجود میں آ گئے تھے جن کا اعتقاد تھا کہ انسان ارادے کی قوت کے بل بوتے پر اپنی بیماریاں دور کر سکتا ہے۔ گویا آپ ارادہ کریں اور صحت مند ہو جائیں! دُنیا کے دوسرے کونے، ہندوستان، میں جوگیوں کے ایک گروہ نے انسانی ارادے کو پُراسرار اور بھیانک جادو میں بدل دیا تھا۔ وہ سانس لینا بند کر دیتے اور ارادے کے ذریعے اپنے اوپر موت طاری کر لیتے۔ کئی گھنٹوں تک وہ زمین کے نیچے دبے رہتے اور پھر ارادے کے ذریعے دوبارہ زندگی میں واپس آ جاتے۔ وہ جلتے ہوئے کوئلوں پر ننگے پاؤں چلتے اور ارادے کی قوت کے ذریعے تکلیف سے محفوظ رہتے۔

جسم کی مصیبتوں اور تکلیفوں پر ذہن کی بالا دستی کا تصور نیا نہ تھا۔ ویرانوں اور صحراؤں میں پرانے زمانے کے مسیحی راہب خدا کے ساتھ ملاپ کی آرزو میں بھوک پیاس، تازیانہ زنی اور کم و بیش ماورائے انسانی تشدد برداشت کیا کرتے تھے۔ کیا مسیح نے انسان کی نجات کی خاطر مصلوب ہونے کا ارادہ نہ کیا تھا؟ جیسا کہ ہم گزشتہ ایک باب میں دیکھ چکے ہیں، جرمنی میں آرتھر شوپنہار نے ارادے کی قوت کا نظریہ قبول کر کے اُس کو زندگی کا غالب اصول قرار دیا تھا۔ اُس کا دعویٰ یہ تھا کہ پودے، حیوان اور انسان صرف جینے کے اندھے اور بے ہودہ ارادے کے بل بوتے اپنی انواع میں اضافہ کرتے ہیں۔ شوپنہار ایسا قنوطی تھا جس کو زندگی میں کوئی اچھائی دکھائی نہ دیتی تھی۔ چنانچہ اس کا استدلال یہ تھا کہ اگر انسان جینے کے اس واہیات ارادے کو موت کے ارادے میں بدل دے..... یعنی اگر انسان ارادے کے ذریعے شادی کرنے، بچے پیدا کرنے اور سانس لینے سے انکار کر دے..... تو پھر اِس دُنیا سے تمام دُکھ درد مٹ جائیں۔ تب انسان کو عدمیت کی خدائی بادشاہت میں فاتح شہزادے کے تخت پر بٹھا دیا جائے گا۔

نطشے نے شوپنہار کے تصورِ ارادہ کو قبول تو کر لیا، مگر ساتھ ہی اُس کو منفی کے بجائے مثبت فلسفہ بھی بنا ڈالا۔ چنانچہ شوپنہار کے برخلاف اُس کا کہنا یہ تھا کہ انسان کو اپنا ارادہ مرنے کی بجائے جینے کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔ دُکھوں اور مصیبتوں سے فرار حاصل کرنے کی خاطر مرنے کا ارادہ کرنا بزدلی ہے۔ دوسری طرف دُکھوں اور مصیبتوں کے باوجود جینے کا ارادہ کرنا جوانمردی ہے۔ ارادے کا اِس قسم کا مثبت پیمانِ حتمی ہم کو خود سے ماورا کر دیتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ، نطشے کے بقول، یہ انسان کو خدا بنا دیتا ہے۔

(2)

نطشے نے اب اپنی زندگی کے معانی پا لئے تھے۔ اُس نے ظفرمندی کی زندگی گزارنا تھی۔ پھر بھی ترک و لاتعلقی اور دہشت کے دورے اس کو پڑتے رہیں گے۔ بات یہ بھی ہے کہ ابھی وہ اپنے مذہب کا خدا نہ بنا تھا۔ اُسی زمانے کی بات ہے کہ لیپزگ میں ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی۔ وہ فوراً شہر سے بھاگا اور اُس کو ہزار بار مرنا پڑا۔ بے وقت موت کا خدشہ اس کے سر پر مسلط تھا۔ اس کا باپ بھی تو بے وقت مر گیا تھا..... اور وہ مرا دماغ کے ضعف کے باعث تھا۔ نطشے خوف سے لرز اٹھا۔ وہ ایک بے بس شخص تھا جو ارادے میں پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔

غصب ہوا۔ پروشیا کی حکومت نے اُس کو فوجی خدمت کے لئے چن لیا۔ اُس نے یہ وجہ بیان کر کے معافی چاہی کہ وہ ایک بیوہ کا بیٹا ہے اور اُس کا واحد سہارا ہے۔ لیکن یہ التجا مسترد کر دی گئی۔ نطشے کو سواروں کے دستے میں شامل کر دیا گیا۔ چند ماہ کی تربیت کے بعد وہ گھوڑے سے گرا اور سینے کا ایک جوڑ اُکھڑ گیا۔ مگر اُس نے سُکھ کا سانس لیا۔ وہ فعال زندگی کے خطرے سے بچ گیا تھا۔ زخم نے اُس کو بستر پر لٹا دیا تھا جہاں وہ انسانی ارادے کی بے چینی کے بارے میں سوچنے لگا۔

فوج سے برخاست ہونے کے بعد وہ اپنی علمی زندگی کی طرف لوٹ آیا۔ ماہر لسانیات کے طور پر اُس کی قابلیت کے چرچے بیسل یونیورسٹی کی فیکلٹی تک جا پہنچے تھے۔ انہوں نے نطشے کو کلاسیکی علم لسان کے اُستاد کی جگہ پیش کی۔ یہ وہ دِن تھے کہ ابھی وہ پچیس سال کا بھی نہ ہوا تھا۔ اُس نے یہ پیش کش قبول کر لی۔ وہ یونیورسٹی کے پُرسکون ماحول

میں اُس کو کچھ عرصے کے لئے دِلی طمانیت بھی حاصل ہوئی۔ لیکن پھر اپنی بازپُرس کرنے کی دائمی عادت اُس کو پریشان کرنے لگی۔ ارادے کی اُس قوت کا کیا ہوا جس کا دعویٰ کرنے کے لئے وہ بے چین رہا تھا؟ وہ میدان اُس کو کہاں ملتا جہاں وہ اس قوت کا اثبات کرسکتا تھا؟ ظاہر ہے کہ لاطینی حروف جار اور یونانی افعال میں اس کی گنجائش نہ تھی۔

یوں ایک بار پھر وہ اپنے مہم باز خوابوں کا تانا بانا بُننے لگا۔ کمرۂ جماعت میں طلبہ کو لیکچر دیتے ہوئے اُس کا ذہن ان خوابوں کے پیچھے بھاگتا رہتا۔ لیکن اچانک وہ اپنی علمی خوابی زندگی سے جاگ اٹھا۔ اُس کے ملک میں زبردست واقعات رونما ہو رہے تھے۔ جرمنی اور فرانس میں جنگ چھڑ گئی تھی۔

اُس نے پروشیا کے ایک گھڑ سوار دستے کو مارچ کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ بتاتا ہے کہ اُسی لمحے اُس کے پورے فلسفے کی صورت گری ہوگئی۔ ''پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ زندگی کے ارادے کا شدید ترین اور اعلیٰ ترین اظہار جینے کی قابلِ رحم جدوجہد میں نہیں ہوتا۔ یہ اظہار جنگ کے ارادے میں، قوت حاصل کرنے کے ارادے میں اور دوسروں کو مغلوب کرنے کے ارادے میں ہوتا ہے۔

نطشے مگر محض فلسفی نہ تھا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ جرمنی اور فرانس کی جنگ میں اُس کو کمزور نظر کی وجہ سے سرگرم خدمت سے بری کر دیا گیا تھا۔ تاہم اُس سے زخمی سپاہیوں کی دیکھ بھال کا کام لیا جانے لگا۔ یوں دوسروں پر غلبہ پانے کے ارادے کی تلقین کرنے والا درشت اور کرخت فلسفہ اب دوسروں کے مصائب کی دیکھ بھال کی تلقین کرنے والی رحم دِلانہ شاعری میں بدل گیا۔ والٹ وٹمین کی طرح نطشے بھی مرتے ہوئے انسانوں کے درمیان جیتا رہا۔ اُس نے لہو دیکھا اور پسینہ سونگھا۔ اُس نے پانی سے شرابور مویشیوں کی گاڑیوں میں مرتے ہوئے سپاہیوں کے ساتھ سفر کئے۔ اس کا دِل کراہت سے .....گھن اور رحم سے لبریز ہو گیا۔ ان تمام مناظر کا مطلب کیا تھا؟ وجود کی، انسانی زندگی کی، وہ ابدی شان و شوکت کہاں ہے جس کا چرچا نبی اور پادری کرتے رہے ہیں؟ کیا زندگی ابدی دُکھ سے عبارت نہیں؟

جنگ ختم ہوئی تو دِفتھیریا کے مرض نے اُس کو پکڑا ہوا تھا۔ وہ پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ صاف اور ٹھنڈی ہواؤں میں وہ ان مسائل پر غور و فکر کرنے لگا۔ وہ اِس نتیجے پر پہنچا کہ کسی نہ کسی طور دُنیا کے اِن تمام دُکھوں کو واجب ثابت کرنا چاہئے۔ انسان ساری

مصیبتوں کے باوجود ناقابلِ شکست اُمید پرست ہے۔ مگر کیوں؟ شاید سبب یہ ہے کہ دُکھ ایک قابلِ قدر، بلکہ یوں کہئے کہ، مقدس تجربہ ہے۔

ہاں۔ بات یہ ہے کہ انسان اپنے ارادے کی قوت کے بل بوتے پر ترکِ زندگی کے کمتر رُجحان پر قابو پا لیتا ہے۔ وہ زندگی کا اَثبات کرتا ہے۔ عظیم ترین شاعروں کو دیکھئے۔ وہ خود اپنے وجود کے لئے مسرتوں کے حمدیہ نغمے گاتے ہیں۔

یوں نطشے نے سوچا۔ اُس کے چاروں طرف دُکھ تھے۔ اور دُکھ سے ہم روحانی اذیت نہیں بلکہ روحانی خوشی حاصل کرتے ہیں۔ تاریخ کے عظیم ترین المیہ نگار کون تھے؟ یونانی تھے۔ سوفوکلیز اور دوسرے المیہ نگاروں کی تحریروں میں بار بار سامنے آنے والا موضوع فانی انسانوں کو لافانی دیوتاؤں کی طرف سے ملنے والی سزا ہے۔ انسان دیوتاؤں کے کھیلنے کی چیز ہے۔ انسان اُن کے ظالمانہ کھیل کا شکار ہے۔ اس کے باوجود یونانی المیوں کا ہیرو اپنے تمام تر مصائب کے باوجود سر جھکانے سے انکار کرتا ہے۔ انسانیت کے ناگوار مقدر کے باوجود وہ اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ انسان بننے اور انسان رہنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ تو دیوتاؤں کی جگہ لینے اور دیوتا بننے پر تیار نہیں! وہ دیوتاؤں کی لافانی خوشی پانے کے لئے اپنے فانی دُکھ سے دست بردار ہونا گوارا نہیں کرتا۔ اُس کو دیوتاؤں کو للکارنے کی اپنی اہلیت پر ناز ہے۔ پرومی تھیس نے آسمانوں سے آگ کا بھید چرایا تھا اور دوست انسانوں کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ انسانی ارادے کی طرف اپنا اثبات کرنے کی پہلی کوشش تھی۔

نطشے نے اِس اسطور کی توجیہہ کی ہے کہ یہ تہذیب کے جنم کی علامت ہے۔ جب انسان نے توہم پرستانہ ہیبت کے ساتھ فطرت کی قوتوں پر دیکھنا بند کر دیا، جب اُس نے اپنے مقدر کو دیوتاؤں کے ہاتھ سے چھین کر خود اُس کا مالک بننے کی کوشش کی، جب آنکھیں بند کر کے اُس کے معجزوں کے لئے دعائیں مانگنے کے بجائے اپنے فائدے کے لئے اپنے ماحول کی قوتوں کو مسخر کرنے کا منظم عمل شروع کیا۔ جب اُس نے دیوتاؤں پر انحصار کرنے کی بجائے جینے کے لئے خود اپنے ارادے پر بھروسہ کیا، تب دُنیا کی تاریخ کی عظیم ترین بغاوت شروع ہوئی۔

یونانی المیہ اور اسطوریات کے صفحات انسانی ارادے کی بلند ہمتی کی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ انسان مصائب اس لئے اٹھاتا ہے کہ وہ آزاد ہونے کا ارادہ کرتا ہے۔ اُس کو دُکھ جھیلنے پڑتے ہیں، کیونکہ وہ دیوتاؤں کے مفادات کے خلاف اپنے حقوق کا دعویٰ

کرتا ہے۔ دیوتا تو اُس کو غلام بنائے رکھنا ہی پسند کرتے ۔ یہی تھا پرومی تھیئس کا مقدر جس کو چٹان سے باندھا گیا اور اذیتیں دی گئیں۔ دیکھیے ناں، آدم اور حوا کا مقدر بھی مختلف نہ تھا۔ اُن کو جنت سے نکالا گیا۔ سچی بات یہ ہے، نطشے کہتا ہے، کہ خدا باغی کو برداشت نہیں کر پاتا۔

خیر، عظیم ترین باغی انسان کے عظیم نجات دہندہ رہے ہیں۔ انہوں نے انسانوں کو دیوتاؤں کے چنگل سے آزاد کروایا ہے۔ جہاں تک نطشے کا تعلق ہے، وہ بغاوت کے مسیحی رویے پر کافرانہ رویے کو ترجیح دیتا ہے۔ مسیحیوں نے آدم کی بغاوت کی مذمت کی ہے جب کہ کافر پرومیتھیس کی قانون شکنی کو جائز سمجھتے ہیں۔ مسیحی کمزور ہیں۔ یونانی بہادر ہیں۔ نطشے کہتا ہے کہ بائبل غلامی کی دستاویز ہے، جب کہ یونانی دیومالا آزادی کی مناجات ہے۔ انسان صرف اُس وقت آزادی سے ہمکنار ہو سکتا ہے جب وہ آسمان کی مخالفانہ بالا دستی کے خلاف اپنے ارادے کا اثبات کرتا ہے۔

اچھا، جب انسان دیوتاؤں کے خلاف کھڑا ہوتا ہے اور اپنی اس بغاوت کے پُر مصائب نتائج بھگتتا ہے، تب اُس کی آزادی کی قوت اور قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ مصائب ارادے کو قوت کا طاقت وَر آلہ بنا دیتے ہیں۔ وہ لوگ احمق ہیں اور کوتاہ نظر بھی جو دُکھ درد اور المیے سے بھاگنا چاہتے ہیں۔ وہ آرام و آسائش کے لئے اپنی انسانیت کا سودا کر دیتے ہیں!

یہ تھا اُس نطشے کا استدلال جو ایک مسیحی پیشوا کا کافر بیٹا تھا۔

(3)

اپنے منہ کے حساس کونوں کو چھپانے کی خاطر اُس نے بھاری مونچھیں رکھ لیں۔ یوں کہہ لیجئے کہ وہ دُنیا کے روبرو خود کو حقارت کے ساتھ پیش کرنا چاہتا تھا۔ اُس کی آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں اور نیم اندھی بھی تھیں۔ وہ قریب کی چیزوں اور لوگوں کو گڈ مڈ کر دیتی تھیں اور بس لا انتہا کے بسیط خلاؤں میں گھور سکتی تھیں۔ اُس کی آواز محبت بھری تھی۔ مگر وہ اُس کو چھپاتا تھا اور جان بوجھ کر تُرشی سے بولتا تھا۔ وہ اکثر لوگوں سے خود کو چھپاتا تھا، کیونکہ اُس کو اُن سے خوف آتا تھا۔ البتہ ایک شخص اُس کے من کو بھاتا تھا۔ اور وہ شخص رچرڈ

ویگنر تھا۔ یوں جانئے کہ وہ بھی ایک پرومی تھیئس تھا جو خدا کی آگ کو چرا لایا تھا اور اُس کو انسان کی موسیقی میں بدل دیا تھا۔

ویگنر کے سوا نطشے کا کوئی دوست نہ تھا۔ اندھیرے کی شان اور دُکھ کی مسرت سے متعلق اپنے عجیب وغریب فلسفے کے ساتھ وہ بس تنہا ہی رہتا تھا۔ اُس کے سر درد کے بار بار کے دورے سے پریشان ہونے والا ایک ڈاکٹر اس قدر احمق تھا کہ اُس نے نطشے کو تنبیہ کر دی کہ اُس کا دماغ بتدریج مفلوج ہو سکتا ہے۔ نطشے یہ بات سن کر سہم گیا۔ صحت کی بحالی کی آس پر وہ پہلے سے زیادہ کمزور ہو گیا۔ تب اُس کو یقین ہو گیا کہ وہ کینسر میں مبتلا ہو کر مرنے والا ہے۔ علاج کی خاطر وہ ایک سینی ٹوریم سے دوسرے سینی ٹوریم کی طرف بھاگنے لگا۔ آخرکار مایوس ہو کر گھر لوٹ آیا۔ اُس کو اپنے آپ سے بھاگنے کی کوئی راہ نہ ملی تھی۔ پھر جب وہ زندگی کے 35 ویں سال میں داخل ہوا تو مرنے کی تیاری کرنے لگا۔ اُس کا باپ بھی تو اسی عمر میں موت کے شکنجے میں آیا تھا۔ وہ بھی بار بار کی اذیت ناک سر دردوں کے ساتھ دماغ کے فالج سے مرا تھا۔ نطشے اِس المیے کو توہمانہ دہشت کے ساتھ یاد کرنے لگا۔ مقدر کی لہریں اپنے مدوجذر میں بڑی باقاعدہ تھیں۔ وہ اُس کے باپ کو بہا کر لے گئی تھیں۔ اب وہ اُس کو بھی نہ چھوڑیں گی۔ وہ کانپ اٹھا۔ دُکھ کے ساتھ اُس نے اپنے نوٹس میں لکھا، ''میرا وقت کسی لمحے بھی پورا ہو سکتا ہے.....''

خیر، اُس کا پینتیسواں سال بیت گیا۔ وہ اب بھی زندہ تھا۔ اُس اذیت ناک سال کے دوران نطشے کو درد کے ایک سو سے زیادہ دورے پڑے تھے۔ پروفیسر شپ سے استعفیٰ دے کر وہ سازگار موسم کی خاطر میرین بار چلا گیا۔ مگر بات نہ بنی۔ وہ جنوبی دھوپ کو برداشت نہ کر پایا۔ اُس نے خود کو ایک چوبارے میں بند کر لیا۔ موت مگر ابھی نہ آئی تھی۔

نیا سال شروع ہوا تو اُس کے سر کو سکون مل گیا۔ درد ختم ہو گئی۔ اب وہ ایک بار پھر زندگی کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ وہ اپنی قید سے نکلا اور پہاڑوں میں چلنے لگا۔ دیر تک وہ بحیرہ روم کے پانیوں کو دیکھتا رہتا۔ وہ گہرے نیلے پانی تھے۔ اور ساحلوں پر باوقار پہاڑیاں تھیں۔ آسمان مگر خاموش تھے..... لاانتہا آسمان خالی تھے۔ وہ انسان کے منتظر تھے۔ انسان آئے اور اُن کا آقا بن جائے۔ اس مقام تک انسان کے پہنچنے میں اگر کوئی رکاوٹ ہے تو وہ انسان کی اپنی بے وقوفی اور اس کا اپنا خوف ہے۔ بدی کے کسی لمحے میں انسان نے وہ افسانہ تراشا تھا جس کو دیوتا اعظم کہتے ہیں۔ تب سے وہ اپنی ہی تراشی ہوئی

اس خرافات کا اسیر چلا آ رہا ہے۔ اس کائنات میں اگر کوئی حقیقی دیوتا ہے تو وہ انسان خود ہے۔ کاش انسان میں اتنی جرات ہو کہ وہ خود کو پہچان سکے ..... اور پھر فوق البشر، یعنی سُپر مین، بن سکے!

نطشے پہاڑوں سے لوٹ آیا اور پھر روم کو چلا گیا۔ اِس شہر میں اُس کی غور وفکر کی زندگی میں ایک طوفانی حادثے نے ہلچل پیدا کر دی۔ ہوا یہ کہ اُس کا تعارف فن لینڈ سے آنے والی لو وان سلومی نامی ایک دوشیزہ سے کروایا گیا۔ اور وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ سلومی حسین تھی، پُر جوش اور دِل لبھانے والی تھی۔ وہ مثالی ساتھی نظر آتی تھی۔ نطشے نے اُس سے شادی کی درخواست کر ڈالی۔ مگر وہ دوشیزہ نہ مانی۔ اُس نے انکار کر دیا۔ وہ ہمارے فلسفی کی ذہنی صلاحیتوں کی قائل تھی اور اِس حوالے سے احترام بھی کرتی تھی۔ مگر بیاہ تو اور معاملہ ہوتا ہے۔ بات یہ بھی ہے کہ عملی طور پر دیکھا جائے تو نطشے پہلے ہی کم و بیش معذور ہو چکا تھا.....وہ شمال سے آنے والی کسی صحت مند جسم کی مالک عورت کا ساتھی بننے کے قابل نہ تھا۔

انکار تو ہو گیا۔ مگر نطشے نے ہمت نہ ہاری۔ اُس نے سلومی کے انکار سے بالکل غلط معانی اخذ کئے۔ وہ یہ سمجھا کہ اس حسین صنم نے شادی سے انکار محض اس لئے کیا ہے کہ وہ اپنے کیریئر سے متعلق منصوبوں میں کسی قسم کی رُکاوٹ نہیں چاہتی۔ نتیجہ اُس نے یہ نکالا کہ چلیے شادی نہ سہی، مگر شادی کے بغیر ہی معاملات کو آگے بڑھانے پر اُس کو کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ ہاں، کیا وہ اُس کی چیلی نہ تھی؟ اور کیا اُن دونوں کے مشترکہ دوست، رچرڈ ویگنر، نے کوسیما کے ساتھ آزاد محبت کی پینگیں بڑھائی تھیں؟

نطشے ان خوش فہمیوں کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ مگر سلومی نے ایک بار پھر اُس کو دھتکار دیا۔ اس مرتبہ فلسفی کا دِل ٹوٹ گیا اور اُس کو توہین کا بھی شدید احساس ہوا۔ وہ اپنی کتابوں کی دُنیا میں لوٹ آیا۔ پھر اُس نے دُکھ دینے والی یہ خبر سنی کہ اُس دوشیزہ نے ایک اور مرد کی طرف سے پیش ہونے والی شادی کی التجا قبول کر لی ہے..... اور وہ فلسفی نہ تھا۔

نطشے کو رنج پہنچا۔ وہ تشنیع و استہزا پر اُتر آیا۔ (زخم کھانے والے ظاہر ہے اور کیا کر سکتے ہیں!)۔ ''اگر دُنیا یا لو وان سلومی کو میں نے بنایا ہوتا تو''، اُس نے حسرت سے کہا، ''وہ دونوں زیادہ مکمل ہوتے''۔

ناکام محبت اُس کو غور وفکر کی ایک اور راہ کی طرف لے گئی.....وہ اب اخلاقی سوال، خیر وشر، پر توجہ دینے لگا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ خیر وشر، نیکی اور بدی، سے متعلق ہمارے تمام خیالات کا منبع خدا نہیں ہے، کیونکہ خدا کا وجود ہی نہیں ہے۔ نہ ہی وہ کسی اعلیٰ تر اخلاقی قانون سے پیدا ہوتے ہیں، کیونکہ ایسا کوئی قانون بھی وجود نہیں رکھتا۔ اصل میں یہ خیالات انسانی ذہن کے ارتقا سے پیدا ہوئے ہیں۔ ''خیر'' یا ''اچھائی'' کی اصطلاح بنیادی طور پر کوئی اخلاقی صفت نہ تھی، بلکہ وہ سماجی اور سیاسی تمیز کو ظاہر کرتی تھی۔ ''اچھے'' لوگوں سے مراد حکمران طبقات تھے۔ ہر سماج میں وہ جنگجو اور اشراف ہوا کرتے تھے۔ ''اچھے'' کا مطلب بہادر، توانا اور مضبوط ہونا تھا۔ اشرافیہ کے وقار کی بنیاد اُس کی قوت پر تھی۔ طاقتور افراد اپنی اقدار کو سماج پر ٹھونس دیتے تھے۔ وہ اپنا ضابطہ اخلاق خود بناتے تھے جو اُن کی اپنی خصوصیات مطابق ہوتا تھا۔ اُس سماج میں بُرے لوگ وہ ہوا کرتے تھے جو اپنی جسمانی کمتری کے باعث نچلی سطح پر رہ جاتے تھے۔ گویا جو طاقتور اور لڑاکا تھا وہ اچھا اور شریف تھا۔ جو کمزور اور بزدِل تھا، وہ بَد تھا۔ اچھا آدمی جنگجو اور آقا ہوتا تھا۔ بُرا آدمی ماتحت اور غلام ہوتا تھا۔

نطشے کا استدلال یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ اخلاقیات کی تاریخ میں ایک بدبخت تبدیلی رونما ہوئی۔ اس کے نتیجے میں خیروشر اور اچھے بُرے کے تصورات اپنے اصل معانی سے محروم ہو گئے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انسانوں کا ایک نیا طبقہ رفتہ رفتہ اوپر کو اٹھ آیا تھا۔ اِس نئے طبقے کے رہنما جنگجو، لڑاکے اور توانا افراد نہ تھے۔ وہ مذہبی پیشوا تھے، یا یوں کہیے کہ کمزور افراد تھے۔ یہ لوگ اپنی جسمانی قوت کے بجائے ذہنی قوتوں پر دارومدار رکھتے تھے۔ سماج پر قبضہ کرنے کی کوشش میں انہوں نے اپنے سابق جنگجو آقاؤں کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے ایک نیا ضابطہ اخلاق نافذ کر دیا۔ چونکہ وہ جسم کی توانائیوں سے محروم تھے لہٰذا انہوں نے نام نہاد ''روح'' کی خوبیوں کا فسانہ تراشا۔ انہوں نے اخلاقیات کا ایسا نظام بنایا جو اُن کی کمزوریوں اور عیبوں کو چھپا لے۔ وہ دوسروں کو تلوار کے زور پر مغلوب نہ کر سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے ''پاکبازی اور دعاؤں'' کے ذریعے حکمرانی شروع کر دی۔ انہوں نے غلاموں کے ''حقوق''، بزدلوں کے وقار اور کمزوروں کی عظمت کے گن گانے شروع کر دیئے اور مقصد بس یہ تھا کہ بہادروں کی فطری جبلتوں کو زنجیر ڈالی جائے اور خود اپنی ناتواں اور ضعیف بالادستی کو قائم رکھا جائے۔ ساتھ ہی انہوں نے ایسا مذہبی پرچار

شروع کر دیا کہ صرف افتادگانِ خاک، حقیر و بے بس لوگ ہی اچھے ہیں۔ غریب، کمزور اور عاجز ہی اعلیٰ ہیں۔ مصیبت زدہ ضرورت مند، محتاج، بیمار اور قابلِ نفرت ہی پاک باز اور مبارک ہیں۔ یہی ہیں جن کو نجات ملے گی۔ لیکن تم .....اشرافیہ والو، قوت و اختیار والو.....تم ہمیشہ کے لئے بد ہو، حریص، لالچی، کافر اور بے دین ہو۔ تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خدا کی رحمتوں سے محروم رکھے جاؤ گے اور تم پر لعنت ملامت ہوتی رہے گی۔

نطشے ہم کو سمجھاتا ہے کہ اس مکاری کے ذریعے ''لومڑی نے شاہین کی جگہ لے لی''۔ اور اخلاقی ضابطے کو الٹ پلٹ دیا گیا۔ یہ بہادروں کے خلاف کمزوروں کا پُرفریب انتقام تھا۔ آقاؤں کو آسمانی بادشاہت سے نکال دیا گیا۔ اجڈ، گنوار اور بازاری آدمی کی اخلاقیات کو فتح حاصل ہوگئی۔ اچھا، تو بھلا غلامانہ ذہنیت کے اس ظہور کو کیا نام دیا جاتا ہے؟ اِس پر ''مسیحیت کے ظہور'' کا لیبل چسپاں کیا جاتا ہے۔ نطشے کا کہنا یہ ہے کہ ''یہ تاریخ کا سب سے زیادہ پارسا فریب ہے''۔ اس کے ذریعے قوت کو بدی بنا دیا گیا ہے اور کمزوری کو نیکی۔ قوت کو شیطان بنا دیا گیا ہے اور کمزوری کو دیوتا۔ مردانگی کے پرانے نظریے کو لاغری کے نئے نظریے میں بدل دیا گیا ہے۔ ''مسیحیت''، نطشے نے کہا، ''غلاموں کی چال ہے''۔

یہ ہے دُکھ درد اُٹھانے والے فلسفی نطشے کی تعلیم۔ ''مہذب'' معاشرے میں ''اچھے اور بُرے ضمیر'' کے سارے چرچے محض ہرزہ سرائی ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ جو کوئی بہادر اور آزاد ہے وہ اپنے کسی فعل کے لئے شرم محسوس نہیں کرتا۔ اچھا، تو کیا جب عقاب چھوٹے پرندوں اور کیڑوں مکوڑوں کو کھا جاتا ہے تو اُس کو اپنے آپ پر شرم آنے لگتی ہے؟ کیا ہم قوت سے یہ مطالبہ کرنے لگیں کہ اُس کو اپنا قوی اظہار نہ کرنا چاہئے؟ توانا جس طرح کمزور نہیں بن سکتا، اسی طرح کمزور بھی توانا نہیں بن سکتا۔

نطشے کہتا ہے کہ اچھے دنوں میں جب کہ تمام اشراف ابھی تک ''بھوڑے درندے'' تھے اور ''تہذیب و شائستگی'' نے اُن کو ناکارہ نہیں بنایا تھا، تو طاقتور جائز طور پر کمزوروں کو قابو میں رکھا کرتے تھے۔ جنگجو دھاڑتے پھرتے تھے اور اپنی فطری جبلتوں کی تسکین کے لئے اپنے کمزور ہم جنسوں کو نشانہ بناتے تھے۔ اُن کو اپنے ظلم و بربریت پر کوئی ندامت نہ ہوتی تھی۔ وہ دہشت کے ذریعے اپنی برتری قائم رکھتے تھے۔ وہ کسی ''اعلیٰ تر قانون'' کو خاطر میں لائے بغیر من مانی کرتے تھے۔ لیکن جب انسان نے اپنی خانہ بدوشی والی عادتیں ترک کر دیں، وہ دیہاتوں میں رہنے لگا، اپنی حفاظت کے لئے اُس نے گروہ بنا لئے، اُس

نے سماجی شعور کو ترقی دی اور جب ایک دوسرے پر انحصار کا احساس پیدا ہونے لگا تو پھر اُس نے خود کو ایک عجیب مصیبت میں مبتلا پایا۔ فطرت نے اُس کو جنگ اور لوٹ مار کی وحشیانہ زندگی کی تربیت دی تھی۔ مگر اب اچانک یہ ہوا کہ اُس کی جبلتیں جامد کر دی گئیں اور وہ ناکارہ ہو گئیں۔ ''میں نہیں مانتا کہ دُنیا میں کبھی اس قدر آفت برپا ہوئی تھی اور اس قدر تکلیف اٹھانی پڑی تھی۔ انسان کی قدیم جبلتوں نے اپنے تقاضے بند نہ کئے تھے۔ بس یہ ہوا کہ اب ان کی تسکین کرنا بہت دُشوار ہو گیا۔ اُن کی تسکین کے مواقع کبھی کبھار ہی نصیب ہوتے۔ انسان کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ اپنی تسکین نئے اور خفیہ قسم کے طریقوں سے کرے۔ جن جبلتوں کو اظہار کا موقع نہیں ملتا، اُن کا رُخ باطن کی طرف ہو جاتا ہے''۔

اب ہوا یہ کہ جب انسان کو نام نہاد تہذیب و اخلاق اور مذہب کے نام پر جبلتوں کے آزادانہ اظہار سے روک دیا گیا تو وہ نفرت، بے رحمی اور دوسروں کو اذیت دے کر مسرت حاصل کرنے لگا۔ یہ سارے جذبے مسخ شدہ انسان کی فطرت بننے لگے۔ نطشے کا کہنا ہے کہ یہی جذبے اُس شئے کا منبع ہیں جس کو ہم ''برا ضمیر'' کہتے ہیں۔ انسان اب رواج کی دبانے والی تنگی اور اکتاہٹ کا اسیر ہو چکا تھا۔ اس صورتِ حال سے بے زار ہو کر اُس نے خود اپنے آپ کو عذاب دینا، ڈرانا اور دِق کرنا شروع کر دیا۔ وہ خود اپنے ساتھ بدسلوکی کرنے لگا۔ انسان کی حالت اُس درندے جیسی ہو گئی جو پنجرے کو قبول نہیں کر پاتا اور آزادی پانے کی آرزو میں زور زور سے سلاخوں سے سر ٹکراتا ہے..... اُس نے اپنی ذات میں ہی اپنے لئے اذیت خانہ بنا لیا ..... ابھی تک وہ اِس سے نجات نہیں پا سکا ہے۔ کیا تماشا ہے۔ انسان اُس بیماری سے تڑپ رہا ہے جس کو انسان کہا جاتا ہے!..... خود کو تکلیف دینے کا ارادہ، اندر کی طرف بڑھنے والی بے رحمی! جب دوسروں کو نقصان پہنچانے کے ارادے کے اظہار کی فطری راہ بند کر دی گئی تو انسان خود اپنے آپ کو نقصان پہنچانے کی راہ پر چل نکلا۔ وہ شہید بن گیا۔ اپنے آپ پر تشدد کرنے کے لئے انسان نے سب سے زیادہ اس تصور سے کام لیا کہ وہ کسی برتر ہستی، کسی بڑے دیوتا، کا مقروض ہے۔ اُس نے خود کو خدا اور شیطان کے درمیان رکھا۔ اور ایک جنت اور ایک دوزخ کو تخلیق کیا۔ آخرکار اس زخم رسیدہ مخلوق نے خود کو ذلیل و خوار کرنے کی تگ و دو کے جنونی لمحے میں وہ شئے تیار کر لی جس کو مسیحیت کا عنوان دیا جاتا ہے۔ کیا ہی الٹی بات ہے..... خدا انسان کو بچانے کی خاطر خود کو ہلاک کرتا ہے..... خدا اپنے آپ کو اپنا

ہی گوشت پیش کرتا ہے۔ ..... قرض خواہ محبت کے احساس کے مارے خود ہی قربانی کا بکرا بن جاتا ہے۔ (کیا آپ یہ سب کچھ مان لیں گے؟)

مدتوں سے دُنیا پاگل خانہ بن چکی ہے، فریڈرک نطشے نے کہا۔

(4)

جو چند دوست نطشے کے تھے وہ بھی ان نظریات سے چکرا کر رہ گئے۔ دہشت زدہ ہو کر وہ اس شرمیلے اور ناتواں شخص کو دیکھنے لگے جس کے ہونٹوں سے یہ آتش فشانی آگ نکلی تھی۔ بس انہوں نے سوچا کہ بہت ہو چکا۔ اب راہ بدلنی چاہئے۔ اور اس شخص سے دور رہنا چاہئے۔ وہ اُس کو بالکل ہی تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ ناقابلِ معافی گناہ اُس سے سرزد ہوا تھا۔ اگر وہ طرزِ عمل کے اعتبار سے نظریے کے اعتبار سے سماج دشمن ہوتا تو خیر برداشت کیا جا سکتا تھا..... وہ تو نظریے کے اعتبار سے سماج دشمن بن گیا تھا۔ اور یہ سب کچھ حدِ برداشت سے باہر تھا۔ حقیقی زندگی میں تو وہ اس قدر نرم دِل تھا کہ کسی کیڑے مکوڑے کو بھی کچل نہ سکتا تھا۔ مگر اپنی کتابوں میں..... توبہ توبہ..... وہ خود آسمان کو مسلنے پر اتر آیا تھا۔ اس دُہری شخصیت سے ہر کوئی دہل گیا۔ دوست ویگنر نے تو صاف صاف کہہ ڈالا کہ نطشے پاگل ہو گیا ہے۔ نطشے نے بھی بدلا اتار دیا۔ وہ دونوں حسبِ معمول سیر کر رہے تھے۔ ویگنر اپنے نئے مذہبی اوپیرا، پارسیفال، کا ذکر کر رہا تھا۔ اس دوران کہنے لگا کہ اُس کو گرجے کی عبادتوں میں دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اور یہ کہ اُس کے پرانے ملحدانہ خیالات بدل رہے ہیں اور وہ خدا اور مسیحیت کی طرف راغب ہوتا جا رہا ہے۔ نطشے نے اُس پر نگاہ ڈالی۔ منہ سے کچھ نہ کہا۔ ہاں، پھر کبھی اُس سے ملنے کو نہ آیا۔

مصیبت اصل میں یہ ہے کہ، نطشے کا کہنا تھا، دُنیا میں مسیحی تو ڈھیروں ڈھیر ہیں، مگر وحشی خال خال ہیں۔ کوئی شخص بھی اُس کی یہ بات ماننے پر تیار نہ تھا، اس لئے وہ ایک اور تنہائی زدہ ہیرو، اچیلز، کی طرح اپنی شاندار تنہائی میں قید رہنے پر مطمئن ہو گیا۔ کبھی کبھی وہ پہاڑوں کی طرف جا نکلتا تھا۔ تخیل کی دُنیا میں وہ خود کو ایسا قدیم کائیشائی دیوتا خیال کرتا تھا جو گرجتے ہوئے بادلوں کے درمیان رہنے اور دُنیا پر اپنے فلسفے کی بجلیاں گرانے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

خیر، وہ دیوتا تھا تو قابلِ رحم دیوتا تھا۔ اُس کی صحت پہلے کی طرح خراب تھی۔ راتوں کی نیند ویران تھی۔ کئی بار اُس نے خواب آور اور بے حس کر دینے والی دوا، کلورل، کی ضرورت سے زیادہ مقدار اس اُمید کے ساتھ کھائی کہ وہ اب دوبارہ نہ اٹھے گا۔ مگر صبح ہوتی تو وہ زندہ ہی ہوتا۔ لگتا تھا کہ موت اُس سے خائف ہے۔ اُس کے نزدیک نہیں آتی۔ بھاگ جاتی ہے۔ آخرکار الپسی پہاڑوں کی بلندی سے زمین کی پستی پر نظریں گاڑ کر اُس نے ایک عہد کیا..... ''او آج کی تنہائی کے مارو، تم جو سب سے الگ تھلگ ہو، ایک دِن تم قوم بن جاؤ گے۔ تم سے، جنہوں نے خود کو چنا ہے، ایک چنی ہوئی قوم جنم لے گی اور پھر اُس سے مافوق البشر پیدا ہوں گے''۔ اُس کی کمزور اور چندھیائی ہوئی آنکھوں کے سامنے رفتہ رفتہ کشف پوری شان و شوکت کے ساتھ جلوہ نما ہوا۔ فوق البشر! ہاں، وہ ایک نئے مذہب کا پیغمبر تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو ایک نیا گیت گانے کے لئے چن لیا تھا''۔

(5)

نطشے نے اپنا یہ گیت ایرانی پیغمبر زرتشت کی زبان سے گایا..... اُس نے شاندار اور الجھاؤ دینے والی نثری نظم لکھی۔

دیکھو دیکھو! زرتشت پہاڑوں سے اتر کر شہر کے دروازوں کی طرف آ رہا ہے۔ وہ اپنے ہونٹوں پر ایک عظیم اور جاہ و جلال والا پیغام لئے آ رہا ہے۔ جنگل میں وہ ایک راہب گوشہ نشین سے ملا تھا جو اپنی دعائیں پڑھ رہا تھا۔ اُس نے پادریوں کو دیکھا ہے جو قربانیاں دے رہے تھے۔ اور اب جب کہ وہ شہر میں آیا ہے تو وہ تاجروں، ماؤں اور بیٹوں کو دیکھتا ہے جو جھکے ہوئے ہیں اور خدا سے پناہ مانگ رہے ہیں۔ ''کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں تک ابھی یہ خبر ہی نہ پہنچی ہو کہ ''بھگوان مر گیا ہے''۔ اس نبی زرتشت نے اس پرانے قصے کو دفن کر دیا ہے۔ ایک نیا زمانہ شروع ہو گیا ہے۔ ''سارے دیوتا مر کھپ گئے ہیں۔ کیا اب ہم چاہتے ہیں کہ فوق البشر زندہ رہے؟'' تمام مخلوق اشیا اب تک اپنے آپ سے آگے نکل گئی ہیں۔ زندگی کی طوفانی لہریں اوپر ہی اوپر کو اٹھتی ہیں۔ اچھا، تو کیا تم اس عظیم چڑھاؤ کے اتار ہی پر مطمئن ہو؟ کیا تم یہ چاہو گے کہ آدمی سے آگے نکلنے کے بجائے پیچھے جاؤ اور حیوان بن کر رہ جاؤ؟ بات اب یہاں نہ رکے گی۔ انسان سے آگے بڑھنا قرار پا

چکا ہے۔ ''میں تم سے کہتا ہوں کہ انسان کے آگے بوزنے کی کیا حیثیت ہے؟ یہی ناں کہ وہ تمسخر کا نشانہ ہے اور شرمناک وجود ہے! یہی حالت فوق البشر کے مقابلے میں انسان کی ہوگی..... تمسخر کا نشانہ اور شرمناک وجود''۔

حوصلہ کرو میرے ہم جنسو! وہ زنگ آلود اور بوسیدہ قدریں تار تار کر ڈالو جنہوں نے انسانی نسل کو زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ بار بار ''خودی'' کہو اور اس پر فخر کرو! م میں تم کو نہ صرف ''خودی'' کہنے بلکہ اُس پر عمل پیرا ہونے کا بھی حکم دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ تمہارے خیالوں اور جذبوں کے پیچھے ایک قادرِ مطلق دیوتا چھپا ہوا ہے..... اور اس کا نام .....میرے بھائیو..... نفس ہے۔ وہ تمہارے بدن میں رہتا ہے..... وہ تمہارا بدن ہے۔ وہ مسلسل تم سے کہتا ہے ''اپنی مسرت تلاش کرو!'' بار بار وہ تم سے کہتا ہے کہ ''جب سے انسانیت معرضِ وجود میں آئی ہے، انسان نے اپنے آپ سے بہت کم لطف اٹھایا ہے۔ میرے بھائیو یہی ہم سب کا گناہِ آدم ہے''۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ لہو انسان کی روح ہے۔ جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اُس میں سے مجھے صرف وہی پسند ہے جو ایک انسان نے اپنے لہو سے لکھا ہے۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دلوں میں پائی جانے والی نفرت اور حسد پر شرمسار نہ ہو۔ نفرت اور حسد کرنا شاندار ہے۔ تم مجھ سے پوچھتے ہو کیا وہ اچھی علت ہے جو جنگ کو بھی محترم بنا دیتی ہے؟ میں تم کو جواب دیتا ہوں کہ وہ اچھی جنگ ہے جو علت کو محترم بنا دیتی ہے۔

یاد رکھو میرے بھائیو کہ انسان برابر نہیں ہیں۔ ابدی انصاف کا کہنا یہی ہے۔ مضبوط اور طاقتور بنو۔ نڈر بنو۔ میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ چھوٹے لوگ جس شئے کو گناہ کہتے ہیں، اُس پر ہنسو۔ اُس کا تمسخر اُڑاؤ۔ تم جو خودی کو مقدس اور خدائی قرار دینے والے ہو، تم خود غرضی، شہوانیت اور ہوسِ اقتدار کو کھلے عام انسانوں کی سچی خوبیاں قرار دو گے۔

لو میں انسانوں کے درمیان پھرتا ہوں اور وہ میرے لئے مستقبل کے ریزے ہیں۔ میں ہماری زندگی کے عظیم عروج سے آگے دیکھتا ہوں۔ میں انسانوں کی ایک نئی، عظیم تر اور زیادہ انفرادیت پسند نسل کی آواز سنتا ہوں..... ان کے حصول قوت کے ارادے کی آواز!

تو یہ باتیں ہیں جو زرتشت نے کہیں۔ زرتشت کی ان باتوں پر مشتمل اپنی کتاب نطشے نے دُنیا کو پیش کی۔ مگر دُنیا نے اُس کو مسترد کر دیا۔ اُس نے اپنی جیب سے چالیس جلدیں

چھپوائیں اور اُن کو تقسیم کرنے پر مجبور ہوا۔ دُنیا کے منظر نامے پر اُس نے بجلی کا کڑکا پھینکا اور پھر خود ہی اُس کی توانائی سے دہل گیا۔ سر کی پرانی دردیں لوٹ آئیں۔ درد نے اُن آنکھوں کو روند ڈالا جنہوں نے دور تک دیکھنے کی جرات کی تھی۔

(6)

وہ اکثر خود سے کہا کرتا تھا کہ یہاں زندہ یا مردہ کوئی نہیں جس سے میں معمولی سا بھی رشتہ ناتا محسوس کر سکوں۔ یہ بات اُس وقت واقعی سچ ہوئی جب اُس کی واحد بہن بھی اپنا گھر آباد کرنے کے لئے اُس کو چھوڑ گئی۔ بس وہی ایک عورت تھی جو زندگی بھر اُس کی دیکھ بھال کرتی رہی تھی اور اُس کے آرام کا خیال رکھا کرتی تھی۔ اُس کا شوہر یہود دشمن تھا۔ اپنے نرم دل اور بدخواہ قلم کے ساتھ فلسفی نطشے اُس سے کوئی سروکار رکھنے پر تیار نہ تھا۔ اُس کی نفرتیں کبھی ذاتی قسم کی نہ تھیں۔ یہودیوں اور غیر یہودیوں دونوں کے لئے اُس کے دِل میں کوئی غصہ، کوئی تلخی نہ تھی۔ وہ افراد کے بجائے ایک غیر شخصی قوت سے برسرِ پیکار تھا۔ وہ خود کہتا تھا کہ اُس کا جہاد خود تہذیب کے خلاف ہے۔ وہ اکیلے ہی اس کو تباہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔

یوں وہ سوئٹزر لینڈ سے وینس، جینیوا سے نائس اور ٹیورن سے میرین بیڈ تک سفر کرتا رہا۔ ہر دم وہ بے چین تھا اور معرکہ آرائیوں میں چین ڈھونڈ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں اِس قدر خراب ہو چکی تھیں کہ وہ مختصر کہاوتوں اور مقولوں سے زیادہ کچھ لکھ نہ سکتا تھا۔ مگر وہ اس کو بھی غیبی اشارہ جانتا تھا۔ کیا پرانے ہاتف اپنی دانائی کو چند لفظوں میں نہ ظاہر کیا کرتے تھے؟ یہ اچھا ہی ہوا کہ اب وہ کتابیں لکھنے کے قابل نہ رہا تھا۔ اُس کی کتابیں فلسفہ تو بہرطور نہ تھیں۔ وہ تو الہام تھیں۔ کیا وہ ایک نئے مذہب.....دجال، مسیح دشمن..... کے مذہب کا پیغمبر نہ تھا؟ وہ کہتا تھا کہ اُس نے تاریخ کے عظیم ترین انقلاب کا عمل شروع کر دیا ہے۔ اُس کی موت کے بعد وہ دِن بھی آئیں گے جب تاریخ کا تعین مسیح کے حوالے سے نہ ہو گا۔ لوگ قبل مسیح اور بعد از مسیح کو بھول جائیں گے۔ وہ تاریخ کو قبل از نطشے اور بعد از نطشے کے زمانوں میں تقسیم کریں گے۔ نطشے سے پہلے کی صدیاں تاریک قرار پائیں گی اور بعد کی صدیاں روشن زمانے کہلائیں گی۔ وہ مسیح کی جگہ لے لے گا اور

دُنیا مسیح کو بھول جائے گی۔ دُنیا میں جو کچھ بھی ہوا ہے، وہ دوبارہ ہو گا۔ یہ ایک ابدی قانون ہے۔ کوئی شئے اِس قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتی۔ ہر شئے بار بار وجود میں آتی ہے۔

دُنیا کی اقوام کو اِس حقیقت سے خبردار ہونے دو! یورپ کی جمہوریتوں کو لرزنے دو۔ ''اگلے پچاس برسوں میں یہ حکومتیں دُنیا کی منڈیوں کی خاطر ایک بڑی جنگ میں کود پڑیں گی.....'' اس کے بعد دنیا دیکھے گی کہ پرانی آگ پہلے سے بھی زیادہ بھیانک انداز میں بھڑک اٹھے گی۔ انسانوں کی راکھ سے درندوں، ماتحتوں اور آقاؤں کی نسل پھر سے اُٹھے گی..... وہ زیادہ طاقتور اور زیادہ خوفناک صورت میں اٹھیں گے''۔ نطشے تنبیہہ کرتا ہے کہ ''جو میرے فلسفے کو برداشت نہیں کر سکتے وہ مٹ جائیں گے اور جو اس کو عظیم ترین نعمت سمجھتے ہیں وہ دُنیا کے مالک بن جائیں گے''۔

اچھا، تو کیا دیوتا فریڈرک نطشے کی ولی کے طور پر پرستش نہ ہو گی؟

(7)

نطشے جب زندگی کی دوپہر تک پہنچا تو شام کی آرزو کرنے لگا۔ اُس کے باطن کا سورج زیادہ ہی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ ''میں انسان تو نہیں ہوں''، اُس نے سرگوشی کی۔ ''میں تو بارود ہوں''۔

رفتہ رفتہ اُس کا ذہن جواب دینے لگا۔ دھوپ سایوں میں ڈھل رہی تھی۔ 3 جنوری 1889 کو، جب اُس کی عمر پینتالیس سال تھی، اُس کو ذہنی دورہ پڑا۔ وہ پیانو پر بیٹھا موسیقی کی جنونی سرمستی میں کنجیوں کی تختی پر ہاتھ مار رہا تھا۔ اُس کے گال سرخ ہو رہے تھے۔

''رات ہو گئی ہے۔ تمام بہتے ہوئے چشموں کا شور بڑھ گیا ہے..... رات ہو گئی ہے۔ عاشقوں کے سارے نغمے جاگ اٹھے ہیں''۔ ''میں ڈائیونی سس ہوں''، وہ چلایا، ''میں خوشی کا خدا ہوں''۔ اب جب کہ اُس کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا، وہ آخرکار جسمانی ثبات کے اعلیٰ ترلمحے تک پہنچ گیا تھا۔

اس عظیم یونانی المیہ کا امکانی خاتمہ بس یہی ہو سکتا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے دیوتاؤں کے خلاف بغاوت کی جرات کی تھی۔ دیوتاؤں نے اس سرکش کو جنون کی تاریکی

میں پھینک ڈالا۔ دس طویل برسوں تک اُس کا بدن ایک آشرم میں سسکتا رہا۔ تب کہیں جا کر وہ موت میں ذہن کے ساتھ جا ملا۔ اُس کے کاغذوں میں سے اُس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نوٹ ملا۔ اُس نے نوٹ پر یوں دستخط کر رکھے تھے..... ''مصلوب''۔

20 عظیم فلسفی

مصنفین

ہنری تھامس ۔ ڈانالی تھامس

مترجم: قاضی جاوید

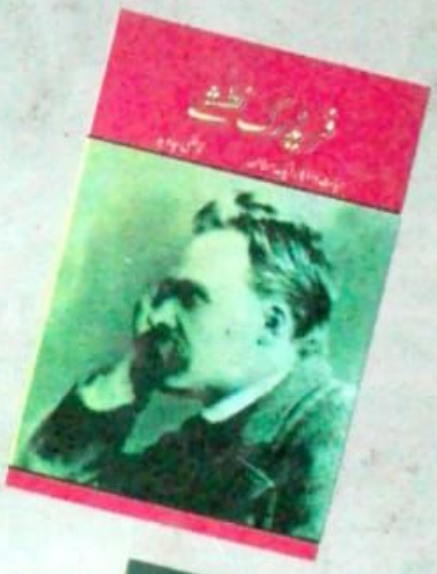

فکشن ہاؤس

18-مزنگ روڈ لاہور

E-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

Ph:042-7249218, 7237430